© rasailojaraid.com

نظرات

صدرِ محمد ایوب خاں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں بیرونی ممالک سے پاکستان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو؟ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "عقلِ سلیم اس امر کی متقاضی ہے کہ پاکستان اس مجموعہ ممالک سے تعلق رکھے جس کی حدیں کاسابلانکا سے جکارتا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس خطے کے ملکوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا ارتباط اور مفاہمت ہونی چاہیئے۔ سیاسی اور فوجی ارتباط نہیں، بلکہ یہ ارتباط معاشی اور ثقافتی ہو۔ ہم سب کی ایک سی ضروریات ہیں اور بہت سی چیزیں ہیں، جو ہم مشترک فائدے کے لیے کر سکتے ہیں۔ متحد ہونے سے ہم سب کو فائدہ پہنچے گا، ان ممالک کے اس طرح کے بلاک کی ایک بڑی زبردست وحدت ہوگی، جس کی آواز کا دنیا میں اثر ہوگا۔ آج دنیا کی چھوٹی قوتوں کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر ہم متفق اللسان ہو کر کچھ کہیں گے، تو دنیا ہماری طرف متوجہ ہوگی، اور ہماری بات سُنے گی۔"

صدرِ مملکت نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ باوجود اس کے کہ مثال کے طور پر ترکوں، ایرانیوں، افغانوں، اور اکثر پاکستانیوں کی ایک ہی اصل ہے، ہم اسے اس حد تک بھلا بیٹھے ہیں کہ ہم یہ محسوس تک نہیں کرتے کہ بڑی طاقتوں اور معاندانہ نظریات کی بیرونی دنیا کے مقابلے میں ہماری سلامتی کا انحصار صرف ایک متحدہ محاذ ہی کے قیام پر ہے

کاسابلانکا سے جکارتا تک واقع ملکوں کا، جن کی آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے، متحدہ محاذ کیسے وجود میں آئے اور اسے کس طرح اتنا مضبوط پائیدار اور راسخ بنایا جائے کہ اس کی ایک آواز ہو جسے بڑی طاقتیں توجہ سے سنیں اس متحدہ محاذ میں شریک ملک باہر والوں کی جارحیت سے محفوظ رہیں۔ اور بڑی طاقتیں ان کے اندر ریشہ دوانیاں بھی نہ کر سکیں، یہ ہے اس وقت سب سے اہم سوال۔ گزشتہ جون میں اسرائیل کے ہاتھوں عرب ملکوں پر جو کچھ گزری اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المیہ کے بعد تو صدر ایوب کی اس تجویز کی کہ کاسا بلانکا سے لے کر جکارتا تک مسلمان ممالک کا ایک متحدہ محاذ ہونا چاہیے، ضرورت اہمیت اور افادیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے اس متحدہ محاذ کی تشکیل میں ان ملکوں کی اپنی اپنی معاشی، سیاسی اور دفاعی ضرورتیں بڑا اہم عنصر ہوں گی کیونکہ آج کے دور میں ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے ملک اکیلے اکیلے نہ تو بڑی صنعتیں قائم کر سکتے ہیں اور نہ اس طرح ان کی دوسری ترقیاتی سکیمیں تکمیل پا سکتی ہیں، پھر دفاع اور دفاعی تدابیر کو بروئے کار لانے کے لیے تو اور بھی باہمی تعاون و اشتراک کی ضرورت ہے۔

یہ سب صحیح، لیکن اس وسیع و عریض خطے کے ملکوں کو اپنی معاشی، سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کے لیے باہم اکٹھے ہونے اور متحدہ محاذ بنانے میں کون سی قوت محرکہ کارفرما ہو گی؟ ظاہر ہے وہ اسلام ہی ہو سکتی ہے۔ اب اگر مسلمان ملکوں کا ایک متحدہ محاذ بنانا ضروری ہے، اور موجودہ حالات میں اس پر ان کی سلامتی کا انحصار ہے۔ نیز اگر یہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کرنا خود ان ملکوں کے متحدہ محاذ کے امکان کا انکار کرنا ہے کہ اس متحدہ محاذ کو خیال سے عمل میں لانے والا سب سے فعّال اور قوی محرک اسلام ہی ہو سکتا ہے، تو پھر ہمیں لامحالہ اسلام کے ان امکانات کا جائزہ لینا ہو گا اور ان کو بروئے کار لانے کے لیے زمین ہموار اور فضا سازگار بنانا ہو گی۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے بے شک اسلام نہ صرف مسلمان ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لا کر ان کا اپنا ایک متحدہ محاذ بنانے پر تیار کر سکتا ہے، بلکہ وہ ساری دنیا کو وحدت انسانیت، اخوت اور مساوات کے اصولوں پر ایک لڑی میں پرونے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن آج اسلام کو اپنا یہ عظیم کردار ادا کرنے کے لیے ایک تو ان تمام تاریخی، ذہنی و مادی ترقیاتی اور سائنسی طاقتوں کو اپنانا ہو گا جو گزشتہ تین سو سال میں جب کہ مسلمان بحیثیت مجموعی غفلت اور جمود کی گہری نیند میں پڑے سوتے رہے، ابھری ہیں اور اب ان کا پوری دنیا پر سکہ رواں ہے، اور دوسرے اسلام کو اپنی چودہ سو سال کی تاریخ کا جائزہ لے کر اس سے وہ عناصر اخذ کرنا ہوں گے جن کی حیثیت باقیات صالحات کی ہے اور جو آج حقیقی اساس بن سکتے ہیں مسلمانوں کو متحد کرنے اور انہیں ایک نئی روحِ یقین و عمل عطا کرنے، نیز پوری انسانیت کو وحدت، اخوت اور انسانیت کا دینی پرانا پیغام دینے کے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی دنیا کا بیدار اور ترقی خواہ ذہن ان خطوط پر آگے بڑھ رہا ہے اگر اسلام کو بطور ایک فعّال اور مؤثر قوت کے باقی رہنا ہے۔ اور مسلمان ملک مسلمان رہتے ہوئے اپنی تقدیر بنانے کے خواہاں ہیں، تو اسلام کو اس مرحلے سے — آپ اسے قرآن و سنت کی طرف لوٹنے کا نام دیں، سلف صالح کی طرف مراجعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تعبیر کریں۔ اسے احیائی کہیں یا تجدیدی کا نام دیں۔ لامحالہ گزرنا ہوگا۔ اور اس کے سوا اس کے لیے کوئی اور چارہ نہیں۔ اسلام اسی صورت میں اور اسی تجدیدی عمل کے بعد ہی مسلمان ملکوں کے اندر ایک کارفرما اور فعال قوت بن سکتا ہے، اور ساری انسانیت کو ایک نیا پیغام امید دے سکتا ہے۔

اسلام کے اس تجدیدی عمل کی پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں فرقوں کے بجائے اُمّتِ واحدہ کا تصوّر اُجاگر ہو۔ اور فرقوں کی چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے باوجود سب مسلمانوں کے ایک اُمت ہونے کا شعور اور جذبہ زور پکڑے۔ اس کے لیے اسلامی تاریخ کو نئے نقطہ نظر سے پڑھنا ہوگا اور مسلمانوں کے گزشتہ مذہبی اختلافات کا تجزیہ کرکے ان کی تاریخی و اجتماعی توجیہات بہم کرنا ہوں گی۔ جیسا کہ اوپر عرض ہوا اسلامی دنیا کا بیدار اور ترقی خواہ ذہن اسی سمت چل پڑا ہے، اور ہمیں امید ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جب مسلمان سے مراد کسی خاص مذہبی فرقے سے متعلق ہونا نہیں ہوگا، بلکہ جس طرح عہدِ عباسی کے دور میں امت نے مَن قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ کے ارشادِ نبوی کو مدار مان کر سب کلمہ گوؤں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیا تھا۔ اور تکفیر اہلِ قبلہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اسی طرح آنے والے دور میں مسلمان کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق مانتا ہے، اور اپنے آپ کو اُمتِ اسلامیہ کا فرد سمجھتا ہے نہ یہ کہ وہ فلاں فرقے سے ہے، اور فلاں فقہی مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔

خانہ کعبہ میں صدیوں سے نمازوں کیلئے چار مُصلّے چلے آتے تھے، اور اس مقدس اور مرکزی مقام تک میں بھی اسلام کی یہ تفریق روا رکھی جاتی تھی۔ موجودہ سعودی حکومت کے بانی شاہ ابن سعود کا یہ کتنا بڑا اور قابلِ تعریف کارنامہ ہے کہ جب اس کا سرزمین حجاز پر تسلط ہوا، تو اس نے یہ چاروں مُصلّے ختم کر دیئے، اور اب سب مسلمان ایک ہی مُصلّے پر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔

اہلِ سنت کے چار فقہی مذاہب کے باہمی اختلافات کی ایک لمبی اور کافی تکلیف دہ تاریخ ہے۔ یہاں تک کہ عرصہ دراز تک بہت سے مسلمان ملکوں میں ہر فقہی مذہب کے الگ الگ قاضی مقرر ہوتے تھے۔ یہ حنفیوں کے فیصلے حنفی فقہ کے مطابق کرتے، مالکیوں کے مالکی فقہ اور شافعیوں اور حنبلیوں کے شافعی اور حنبلی فقہ کے مطابق، اب اکثر مسلمان ملکوں میں ان مذاہب اربعہ کو ایک کیا جا رہا ہے، اور نئے فقہی اور قانونی ضوابط کی تشکیل و تدوین میں چاروں مذاہب سے استفادہ کرکے ایک مشترکہ فقہ منضبط ہو رہی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہلِ سُنّت کے مختلف مسالک اور مذاہب کا جو صدیوں تک باہم برسرِ پیکار رہے ہیں، یوں متحد ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ مستقبل کے لیے ایک مبارک فال ہے۔ یقیناً جیسے جیسے مسلمانوں میں یہ تجدیدی عمل وسیع تر اور عمیق تر ہوگا، مسلمانوں کی آئندہ نسلیں ان فقہی اختلافات کو دوسری نظر سے دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی۔ اور ان کے ہاں فقہی و کلامی کثرت میں امت کی وحدت کا اصول زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔

یہ تو اہلِ سنت کے مختلف فرقوں کا معاملہ ہوا۔ امّت کا دوسرا بڑا گروہ شیعہ ہے۔ شیعہ اور اہلِ سنت کے اختلافات صدیوں سے چلے آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض مسلمان ملکوں میں یہ عملی رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ جہاں تک دورِ حاضر اور آئندہ کے لیے فقہی ضوابط مرتب کرنے کا تعلق ہے، اس ضمن میں اگر اہلِ سنت کے مذاہب اربعہ کو مرجع اور سند بنایا جاتا ہے، تو اس کے ساتھ ہی زیدی، اثنا عشری اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کی فقہوں کو بھی مرجع اور سند بنایا جائے، اور اس طرح جس فقہ سے آج کی ضرورتوں کے لیے زیادہ مناسب، زیادہ قابلِ عمل اور زیادہ مصلحتِ عامّہ کے مطابق قانون مل جائے، اسے لے لیا جائے، اور یوں ایک جامع فقہ مدون ہو۔

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں میں مرکز گریز فقہی کلامی اور فرقہ وارانہ تحریکیں اٹھتی تھیں، لیکن اب بین الاقوامی سیاسی حالات اور نئے معاشی، اجتماعی اور سائنسی تغیرات مسلمانوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اسلام کو مرکز گریزی کے بجائے مرکز کی طرف آنے کا ذریعہ بنائیں۔

لیکن اسلامی دنیا کی یہ ذہنی تحریکیں اور فکری رجحانات اس وقت تک اپنے منطقی نتائج کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ جب تک کہ مسلمان سائنسی تفکّر اور سائنسی طرزِ عمل کو جو علوم کے سب شعبوں اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر آج حاوی ہے نہیں اپنائیں گے۔ سائنسی تفکّر اور سائنسی طرزِ عمل کا اس دور میں وہی مقام ہے، جو کسی زمانے میں مسلمان اہلِ علم کے ہاں منطق کا تھا۔ جسے انہوں نے یونان سے مستعار لیا تھا۔

ہنگری کے مستشرق ڈاکٹر جرمانوس نے جو اسلام لانے کے بعد الحاج عبدالکریم جرمانوس کے نام سے مشہور ہیں، اپنے ایک مقالے میں مسلمان قوموں کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کا جامد مذہبی اندازِ فکر ختم ہو گیا اس کی جگہ تشکک اور تجربیت نے لے لی۔ جس سے کہ سائنس کو فروغ ہوا۔ اور ابتدائی زرعی معیشت کی جگہ سرمایہ دارانہ اور صنعتی طریقِ پیداوار نے لے لی۔ نیز یورپی جہاز راں زمین کے گرد چکر لگانے میں کامیاب ہوئے اور امریکہ کا انہوں نے انکشاف کر لیا۔ اس سے جہاں یورپ میں سائنسی اور ٹیکنیکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترقی کی کوئی حد نہ رہی، وہاں علوم و فنون، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کو پروان چڑھنے کے بھی مواقع ملے۔ اس تمام عرصے میں اسلامی مشرق گہری نیند سویا رہا۔ اس کی صنعتیں زمانے سے پیچھے رہ گئیں۔ اس کی اقتصادی زندگی خام اجناس پیدا کرنے والی ابتدائی زرعی معیشت تک محدود ہو گئی۔ اس کی درس گاہوں میں وہی کتابیں پڑھائی جاتی رہیں، جو صدیوں سے پڑھائی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کا اندازِ فکر روایات ماسبق کا پابند ہو گیا۔ اور ان کے ہاں علم کے معنی صرف اِدھر اُدھر کی جمع شدہ معلومات کو یاد کرنا سمجھے گئے۔ چنانچہ جب انیسویں صدی شروع ہوتی ہے، تو اسلامی دنیا مکمل جمود سے نڈھال یورپ کے قدموں پر گری پڑی تھی۔ اور زہد و تقویٰ میں ڈوبا ہوا مشرق اہلِ یورپ کی معاشی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن رہا تھا۔

پروفیسر الحاج عبدالکریم جرمانوس کے نزدیک اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی جس نے مسلمانوں میں بیداری کی رو پیدا کی۔ چنانچہ جہاں جہاں یورپی دباؤ زیادہ تھا وہاں اس بیداری کے آثار زیادہ نمایاں ہوئے۔ اور انیسویں صدی کے آخری حصے میں مسلمان اہلِ قلم اپنی اپنی قوموں کی توجہ یورپ کی طرف دلانے لگے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ دہ "اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں تحقیق و جستجو کی آزادی اور رائے عامہ کو جسے ہم آج کل بجا طور پر "روحِ عصر" کا نام دے سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کا فیصلہ کن معیار تسلیم کیا تھا۔ اسلام شروع ہی سے مابعد الطبیعاتی بندھے ٹکے اذعانی عقائد کی زنجیروں سے آزاد رہا ہے۔ اس میں اس طرح کے ترکیبی اور ہم آہنگ ارتقا کے امکانات موجود تھے کہ ابتدا ہی سے اس میں بندھے ٹکے عقائد کے معاملے میں تشدد بار نہ آ سکا۔"

لیکن صدیوں کے جمود نے مسلمانوں کی نظروں سے اسلام کا یہ خصوصی وصف اوجھل کر دیا ہے۔ بے شک اسلام میں کوئی منظم کلیسائی نظام نہیں، لیکن جمہور مسلمانوں کا علماء کے زیر اثر کسی عقیدے کے بارے میں جو شدید ردِ عمل ہوتا ہے اس کی نوعیت کم و بیش ایک منظم مذہبی نظام کی سی ہے۔ سابقہ اجماع کے نام سے قدامت کے ہر شاہبے کو اسی طرح منوایا جاتا ہے، جس طرح کلیسائی نظام مخلص عیسائیوں سے اپنی بات منوایا کرتا تھا۔ پروفیسر جرمانوس لکھتے ہیں۔ آج کل سے جامعہ ازہر کی درس گاہ کا سرکاری مجلہ مستقل طور پر ایسے فتوے شائع کرتا رہتا ہے۔ جن میں فتوے پوچھنے والوں کو بتایا جاتا ہے کہ آیا فلاں دوائی کا استعمال یا فلاں صنعتی کام کرنا یا فلاں فیشن کا لباس پہننا یا کوئی خاص کتاب پڑھنا شریعت اسلامی کی رو سے جائز ہے یا نہیں بات یہ ہے کہ اسلامی قانون زندگی کے ہر پہلو پر حاوی سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ بڑی سختی سے پوری انسانی زندگی کو ضابطے میں ڈھالتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موصوف کے نزدیک اس صورتِ حال کا ذمہ دار مذہب اسلام کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے الفاظ میں:-

اسلام کا قرونِ وسطیٰ کے تاریک زمانے میں بہت بڑا تہذیبی کارنامہ تھا کہ اس نے اس زمانے میں ان جاہل اور مخلط کار انسانوں کو زندگی میں رہنمائی کے لیے ایک باقاعدہ نظام دیا جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نہایا کیسے جاتا ہے اور معقول طریقے سے خاندانی زندگی کیسے گزاری جاتی ہے اور جن کے یہاں انصاف محض وحشیانہ طاقت پر منحصر تھا۔ اور جن کی تہذیب عبارت تھی دُور از کار رفتہ توہمات سے۔ البتہ آج ہم ان لوگوں سے محاسبہ کرسکتے ہیں جو محض اپنی پیشہ وارانہ اغراض کے لیے اس بیسویں صدی میں اپنے ساتھی انسانوں کو دسویں صدی کے وسائل اور حالات کے مطابق چلانا چاہتے ہیں اور جو اس حقیقتِ واقعی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں کہ مذہب اسلام انسانوں کے لیے ہے۔ اور یہ محض زبانی خدمت کی غرض سے وجود میں نہیں آیا۔ مشرق میں جامد اور فرسودہ ذہنیت نے اسلام کا صحیح ارتقاء روک دیا ہے۔

ہر مسلمان ملک میں آزادی کے بعد یہ کوششیں جاری ہیں کہ وہ اس خلا کو جو اسلامی مشرق کے ایک جگہ کھڑا رہنے، بلکہ اُلٹا پیچھے کو جانے اور یورپ کے برابر آگے بڑھ کر ترقی کرنے سے گزشتہ دو تین سو سال میں پیدا ہوگیا ہے، اسے بھر دیں اسے آپ 'تفرنج' کہیں، یورپ سے مرعوبیت کا نام دیں، یا اسے اسلام کو ترک کرنے سے تعبیر کریں، یہ یورپ کے نظم و نسق، اس کی سائنسی تخلیقات اور اس کے اجتماعی اداروں کو اپنانے کا عمل جاری رہے گا۔ ہر مسلمان ملک اس راہ پر گامزن ہے۔ کوئی اس میں آگے بڑھ گیا ہے، اور کوئی پیچھے ہے۔ یہاں تک کہ افغانستان کو بھی اسی نہج پر چلنا پڑا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی ملک امان اللہ خان کو اسی بنا پر تاج و تخت سے محروم کرچکا تھا۔ اور تو اور سعودی عرب کے موجودہ فرمانروا شاہ فیصل اجتماع و حکومت دونوں میں جدید اسالیبِ زندگی کو بروئے کار آنے کی اجازت دے رہے ہیں، اور اسی چیز نے انہیں سعودی عرب کے طبقۂ منورین میں مقبول بنایا ہے۔

یہ خیال کہ مسلمان یورپ سے بے تعلق رہ کر — یہاں یورپ سے مراد امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ صنعتی ملک ہیں — ترقی کی اس منزل پر پہنچ سکتے ہیں، جہاں وہ باقی دنیا کے مقابلے میں اپنا آزاد اور باوقار وجود قائم رکھ سکیں، ناممکن ہے عرب میں وہابی تحریک اپنے دورِ اول میں، سوڈان میں مہدوی تحریک اور اس برصغیر میں حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی مشرق زندگی کی دوڑ میں مغرب سے پیچھے رہ گیا ہے۔ اور اس کے لیے مغرب سے استفادہ کیے بغیر اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے شک وہابی اپنے دو ادوار میں ناکام رہے۔ اور محمد علی پاشا کی یورپی تربیت یافتہ فوج کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، لیکن جب ابن سعود نے ریاض سے حجاز کا قصد کیا تو گو وہ عقیدتاً اسی طرح کا پکا اور مخلص وہابی تھا، پر وہ کویت میں رہ کر نئے زمانے کی نئی ضرورتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے سعودی مملکت کی تشکیل و تنظیم میں انہیں ملحوظ رکھا۔ اور جب اس کے حامیوں کے کٹر گروہ سے مخالفت ہوئی، اور اس نے ابن سعود کی اصلاحات کو بدعات قرار دے کر اسلام کے نام سے اس کے خلاف شورش کی تو ابن سعود نے بڑی سختی سے اس گروہ کو کچل دیا۔

یہاں سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں کو سکھوں کی ایک حد تک یورپی تربیت یافتہ فوج کے خلاف معرکہ آرا ہونا پڑا۔ اور اس کا نتیجہ شکست تھا۔ یہ سنہ ۱۸۳۱ء کا واقعہ ہے اس کے بعد انگریزی دور حکومت میں اسی علاقہ کے مسلمان جدید فنون جنگ سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت پاتے ہیں۔ جدید سے جدید اسلحہ بہم کرتے اور انہیں چلانے کی مشق کرتے ہیں۔ اور پھر جب سنہ ۱۹۶۵ء میں پورا ہندوستان ان کے خلاف چڑھ کر آتا ہے، تو وہ اس کو کس طرح زک دیتے اور اس کے ارادوں کو ناکام کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔

صدر مملکت نے اپنی اس دفعہ کی ماہانہ نشری تقریر میں عرب اسرائیل آویزش کا ذکر کرتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے فرمایا:۔

میں نے حال ہی میں یروشلم کے مفتی اعظم اور عراق کے علماء کے ایک وفد سے یہ کہا کہ عالم اسلام کو موجودہ حقیقتوں کا سامنا کرنا چاہیئے یہ زمانہ پرانے قصے کہانیوں کا زمانہ نہیں ہے جب تک ہم لوگ اپنے باہمی جھگڑوں کو مٹا کر باہمی اتحاد اور موجودہ سائنسی دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے اندر اقتصادی اور سماجی استحکام پیدا نہیں کرتے اس وقت تک ہماری سالمیت خطرے میں رہے گی۔

تہران (رامسر) کے اجلاس میں بھی میں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں سب سے پہلے اپنے ملکوں میں قومی یگانگت اور اتحاد قائم کرنا چاہیئے۔

غرض مسلمان ملکوں کا داخلی اور باہم ایک دوسرے سے اتحاد اور سائنسی نظام فکر اور نظام کار کا اپنانا، جسے اپنائے بغیر نہ ہم فوجی لحاظ سے مضبوط ہو سکتے ہیں، اور نہ ہمارے ہاں اقتصادی و سماجی استحکام ممکن ہے آج وقت کی سب سے اہم اور فوری ضرورتیں ہیں۔ اور وہ طبقے جو مختلف ناموں سے اس میں حارج ہیں۔ وہ نہ صرف جمہور مسلمانوں کے مفادات سے غافل ہیں بلکہ وہ اسلام کی بھی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔

© rasailojaraid.com